سر سیّد کے اُسلوب میں طنز کے رنگ

ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک

Dr. Ishfaq Ahmd Virk

Abstract:

Sir Syed Ahmad Khan was the founder of modern Urdu prose. His style of writing is simple, straightforword and satirical. Uptill now, not ample research has been done on the element of satire in his works. In this article, the researcher has tried to explore omnipresent presnce and treatment of satire and humor in prose of Syed Ahmed Khan. To prove and support this point solid and pertinent examples have also been quoted and discussed. This staire in writings of Sir Syed has various shades. At some points he seems to point out/highlight illetracy, narrow- mindedness, and morality of Muslims of subcontinent. At the same time, prejudice and conspiracies of Hindus are also subject of his satire. Sometimes, at some points, he appears to criticize Muslims clergy who is opposing modern education. His satire is coated with humour sometimes but ususally it is straight and sharp.

سر سید احمد خاں اور طنز کا عمر بھر چولی دامن کا ساتھ رہا۔ ایک طرف وہ قلم کا کوڑا اٹھائے ذہنی و عملی جمود کا شکار مسلمانوں کی تہذیب پہ کمر بستہ تھے، تو کہیں قدم قدم شاطرانہ تعصب کے گُل کھلانے والے ہندوؤں کی باطن کشائی کا فریضہ بھی انھوں نے اپنے سر لے رکھا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزوں کی مفاد پرستانہ جانب داری بھی ان کے قلم کی زَد میں آتی رہی۔ اسی طرح دوسری جانب لکھنؤ کے من چلے، اودھ پنچ کے دل جلے، اور اکبر الٰہ آبادی کے چونچلے عمر بھر ان کا پیچھا کرتے رہے۔ اکبر نے تو پبلک کے پُرزور اِصرار پر سر سید کے ساتھ ساس بہو کا ایسا رشتہ اُستوار کیا کہ ایک کی آمد دوسرے کی آورد کے ساتھ عمر بھر آنکھ مچولی کھیلتی رہی۔ اور پھر سر سید کی موت کے بعد سیانی بہو کی مانند، ایک دم ہَجو کا رُخ قصیدے کی طرف موڑ دیا، فرمایا:

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، ایف سی کالج یونیورسٹی، لاہور

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے، کرنے والے میں

۱۹۰۶ء میں جب مولانا حالی حیدرآباد میں مقیم تھے، جہاں سرسید کی برسی نہایت شان وشوکت سے منائی جاتی تھی، وہاں اپنے خطاب کے دوران انھوں نے اپنے اس عظیم رفیقِ کار کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

''یہ اُس شخص کی برسی کی تقریب ہے جس نے پچاس برس متصل ملک اور قوم کی خیرخواہی اور اسلام کی خدمت گزاری میں بسر کیے، اور باوجود سخت مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے اخیر دم تک اُس کو پیش آتی رہیں، وہ اپنے ارادوں میں نہایت استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہا۔ خود مسلمانوں نے جن کی خیرخواہی میں اس نے اپنی دو تہائی زندگی صرف کی، اُس کو کافر، ملحد، نیچری، دجّال، سب کچھ کہا، اُس کے کفر پر سیکڑوں فتوے لکھائے گئے۔ اُس پر اور اُس کے کاموں پر طرح طرح کی تہمتیں لگائی گئیں۔ اُس کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ اُس کے برخلاف مُلک کے ہر گوشے سے نئے نئے اخبار اور رسالے برابر جاری ہوتے رہے مگر اُس نے کبھی ہمت نہ ہاری اور جو منصوبہ مسلمانوں کی بھلائی اور خیراندیشی کا ابتدا سے باندھا تھا۔ اُس کو دمِ واپسیں تک پورا کرتا رہا۔''(۱)

اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ حالی اور سرسید جیسی مخلص اور سراپا ہمدرد ہستیاں شاید و باید ہی کسی قوم کو نصیب ہوئی ہوں۔ علم وحلم کی بے پایاں صفات و کرامات اپنے اندر سموئے ہوئے یہ دونوں شخصیات چاروں اور مخالفت کی مسلسل یلغار کے باوجود عمر بھر قوم کی حالت سدھارنے اور انھیں تعلیم و ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے استطاعت سے بڑھ کر کوشاں رہیں۔ بے زاری و بے کاری کی بیماری میں مبتلا قوم کو نہ صرف عظمتِ رفتہ کا احساس دلایا بلکہ ان کی حالتِ زار پر آنسو بھی بہائے۔ دسمبر ۱۸۹۸ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بارھویں اجلاس منعقدہ لاہور، جس میں علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کی تجویز پیش ہوئی، میں مولانا حالی کی ارسال کردہ تقریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''صاحبو! اگرچہ ہماری قوم کا میلان ایک عرصۂ دراز سے روز بروز پستی کی طرف ہوتا جاتا تھا، اُن کی تمام خوبیاں آہستہ آہستہ مٹتی جاتی تھیں۔ علم میں، دولت میں، اخلاق میں، درجے میں، وہ اپنی ہم وطن قوموں سے گرتے جاتے تھے مگر یہ پستی اور تنزل بہ ظاہر چنداں محسوس نہ ہوتا تھا۔ دفعتاً ۱۸۵۷ء کے غدر کی آندھی اٹھی جس نے اس ٹمٹماتے چراغ کو بالکل بجھا دیا۔''(۲)

حالی کے اس تفکر میں تاسف بھی ہے اور طنز کی ہلکی سی جھلک بھی۔ ان کے اسلوب میں تفکر،

تأسف اور طنز کا یہ تاثر بلاشبہ سرسید کی دین ہے۔ سرسید جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں مسائل کی یلغار اور زندگی دشوار دیکھ کے پہلے تو کسی اور پُرامن اور پُرفضا مقام پہ منتقل ہونے کی نیت باندھی لیکن پھر مسلمانوں کی دِگرگوں حالت کا احساس کر کے بقول شخصے: 'اسی آگ میں کود پڑے۔' یہ ایسی آگ تھی جس میں ہندوؤں کی چالاکی اور انگریزوں سے ناچاقی کی بنا پر مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل، سب کچھ جھلس کے رہ گیا۔ سرسید کو اس بات کا شدت سے احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد منظرِ عام پہ آنے والی اپنی ہر تصنیف میں اپنے سابقہ ٹھنڈے میٹھے موضوعات اور مسجع و مقفّیٰ اسلوب کو ترک کر کے تیکھا اور دوٹوک انداز اختیار کر لیا۔ ان کو بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اب عبارت آرائی سے محض جگ ہنسائی ہاتھ آئے گی اور دلوں میں اترنے کے لیے فطری اور سادہ محاورہ کام آئے گا۔ خود فرماتے ہیں:

''وہ پہلا سا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹا جاتا ہے، بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اُردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بہ روز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے، خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔۔۔ نئی اُردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میر و درد اور ظفر نے اُردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو، کی ہو؛ مومن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو، کہہ دی ہو؛ جو اُس سے زیادہ فصیح و دلچسپ و بامحاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کے سُلاتے وقت اُن کو کہانی سناتی ہے۔''(۳)

اس کے بعد اُن کی تحاریر میں طنز اور تنقید کا عنصر بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ وہ ایک کھرے اور متحرک انسان، موحد مسلمان، بے ریا سیاست دان اور سیدھے سادے قانون دان تھے۔ سُستی، بے عملی، منافقت اور عیّاری، نہ انھوں نے سیکھی تھی، نہ اُن سے برداشت ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا منفی رویوں سے انھیں جہاں بھی واسطہ پڑتا وہ قلم کو کمان پہ دھر لیتے۔ پھر اُن کے سامنے چاہے موقع پرست ہندو ہوں یا بداندیش انگریز، اُن کے بالمقابل اخلاق سے عاری مسلمان ہوں یا مجہول مولوی، وہ ہر ایک سے بھڑ جانے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتے تھے۔ اسی مزاج کی بنا پر اُن کی تحریروں میں ظرافت اور شگفتگی کی رمق کم کم اور طنز و تعریض کا عنصر زیادہ ہوتا چلا گیا۔ مولانا اسماعیل پانی پتی 'مقالاتِ سرسید' کے طویل دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''سرسید کے مضامین میں ظرافت کا عنصر بھی خاصا ہوتا تھا مگر پھکّڑپن سے خالی اور بازاری الفاظ سے معرا۔ مزاحیہ فقرے ایسے لطیف ہوتے تھے کہ مخالف کو ناگوار بھی نہ ہوں اور طنز بھی بھرپور ہو؛ مثلاً ایک ایڈیٹر نے لکھا کہ: ''جو آدمی پرچہ 'تہذیب الاخلاق' کی تائید کرے گا، وہ 'خسر الدنیا و لآخرہ' کا مصداق ہوگا۔'' اس کے جواب میں سرسید فرماتے ہیں: 'بھئی! 'تہذیب الاخلاق' کے معاونوں، خریداروں، پڑھنے والوں، چھونے والوں،

پاس سے دیکھنے والوں، دور سے دیکھنے والوں، خواب میں دیکھنے والوں، خیال کرنے والوں سے ہوشیار ہوجاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ 'خسر الدنیا و لآخرہ' ہو جاؤ۔''(۴)

قبل ازیں لکھنا پڑھنا اُن کا مشغلہ تھا، اب گلے کا ڈھول ہوا۔ پہلے وہ میٹھے ماضی کی دُھن میں مگن تھے، اب کڑے حال کا سورج سوا نیزے پر تھا۔ صرف اور صرف ذاتی مفاد کی دُھونی رمائے رکھنے والا عیار ہندو ایک طرف، جیت کے نشے میں سرشار اور آنکھوں سے انتقام کے شعلے برسانے والا انگریز دوسری جانب، نیز جوابی انتقام پہ مُصر، دینی و دنیاوی جہالت پہ قانع اور ہٹ دھرمی پہ بضد مسلمان اور پرانی وضع اور گھسی پٹی روایات کو کھال کی مانند اوڑھے شاعر، ادیب، علما اور نام نہاد دانشور، سرسید کو اِن سب کے خلاف ایک ہی قلم سے چومکھی لڑائی لڑنا تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید کی تحریروں میں طنز کی دھار ۱۸۵۷ء کے بعد نمودار ہوئی۔ اس سانحے کے بعد اگرچہ اُن کی پہلی تحریر 'تاریخِ سرکشی بجنور' (۱۸۵۸ء) ہے لیکن اس میں سرسید کا اسلوب کچھ دبا دبا، گھُٹا گھُٹا، خوشامدانہ، وفادارانہ، معذرت خواہانہ اور 'رپورٹ پٹواری مفصل' ایسا ہے۔ سوائے نجیب آباد کے نواب محمود خان کو 'نا محمود خان' کہنے کے، جی حضوری کی تان کہیں ٹوٹنے نہیں پاتی لیکن 'اسبابِ بغاوتِ ہند' (۱۸۵۹ء) تک آتے آتے تو اُن کے قلم کے پنجے خاصے نوکیلے ہو چکے تھے۔ یہاں سرسید کا اسلوب خاصا دبنگ، مدلل، کاٹ دار اور ایک کامیاب وکیل والا ہے۔ وہ انگریزوں کو اُن کی غلط اور غیر ضروری پالیسیوں کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایا ہندوستان کی، ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی اور اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں اور کوئی شخص اُن کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر اُن کے غلط خیال کو دور کرنے والی نہ تھی۔ جب کہ رعایا کا گورنمنٹ کے ساتھ یہ حال ہو جو دلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہیے تو پھر کیا توقع ہو سکتی ہے؟''(۵)

پھر سرسید نے انگریز حاکموں کو مقامی لوگوں کی سرکشی کے جو پانچ بنیادی اسباب بتائے، ان میں پہلے کا لُبِ لباب اوپر والے پیراگراف میں مذکور ہو چکا۔ ذرا باقی چار پہ بھی ایک نظر ڈالیں کہ یہاں ان کا لہجہ کتنا پُراعتماد، شوخ اور کٹیلا ہو چکا ہے:

''دوم: جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریقۂ حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

سوم: ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادت اور ان مصائب سے جو اُن پر گزرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹتا جاتا تھا۔

چہارم: ترک ہونا اُن امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے، جن کا بجالانا ہماری گورنمنٹ

پر، ہندوستان کی حکومت کے لیے واجب اور لازم تھا۔
پنجم: بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی۔''(۶)

اس رسالے کی اشاعت سے اگرچہ سرسید کے بعض دوستوں نے انھیں منع کیا تھا۔ بہت سے انگریز دوست بھی جز بز ہوئے، بلکہ کچھ نے تو ان کے لیے بغاوت کی سزا بھی تجویز کی۔ سچ بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں سرسید کو بعض وضاحتیں بھی کرنا پڑیں مگر ان پر قومی مفاد میں کیے گئے اس اقدام پر ندامت کی بجائے، طمانیت کا احساس غالب تھا، بقولِ داغ: لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا

مولوی عبدالحق اس رسالے کی اہمیت و افادیت اور سرسید کی دیدہ دلیری کا اِن الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں:

''ایسے زمانے میں جب آزادی کے نام پر زبان کٹتی ہو، حاکم کی زبان ہی قانون ہو، مارشل لا کا دور دورہ ہو، اور مسلمان ہونا بذاتِ خود ایک جرم ہو، ایسی حیرت انگیز اخلاقی جرأت کا اظہار سید احمد خاں ہی کر سکتے تھے، اس پر انگریز حکام بہت برہم ہوئے، اور بعض نے مصنف کو باغی اور قابلِ دار قرار دیا مگر یہ رسالہ انجام کار بغیر اثر کیے نہ رہا۔''(۷)

اس کے بعد تو یوں سمجھیے کی سرسید کا قلم طنز و تنقید کے میدان میں سرپٹ بھاگتا چلا گیا۔ وہ اپنے مشن کے راستے میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو نشانہ بناتے چلے گئے۔ ہمارے ہاں سب سے حسّاس موضوع مذہب ہے، سرسید کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی جانب راغب بھی کرنا چاہتے تھے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ وہ اپنے مذہب سے بھی بیگانہ نہ ہو جائیں۔ وہ اپنے ایک مضمون 'مسلمان کی تعلیم: دین و دنیا کا امتزاج' میں اس خدشے کا اِس طرح اظہار کرتے ہیں:

''اِس بات کا شدید خطرہ ہے کہ جدید علوم و فنون کی تحصیل کے بعد ہمارے مسلمان دین سے بیگانہ اور مذہب سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اِن میں مذہب کی محبت اور اسلامی عقاید کی اُلفت باقی نہیں رہتی۔ وہ دین کو فضول اور اسلامی عقاید کو ایک کھیل سمجھنے لگتے ہیں۔''(۸)

عام مسلمانوں سے بھی زیادہ اُن کو مسلم علما کی مادیت پرستی، ہٹ دھرمی، فرقہ باز طبیعت، غیر ذمہ دارانہ رویوں اور عناد پسندی سے تحفظات تھے۔ ذرا اِن پیٹ کے پجاری علما کے طرزِ عمل اور ترجیحات کے بارے میں سرسید کا اندازِ تحریر ملاحظہ کیجیے:

''اُن کی مخالفت دراصل اِس وجہ سے نہ تھی کہ وہ مسئلہ مسلمانوں کے مروجہ مذہب کے بر خلاف ہے، بلکہ متعصب مسلمان مولوی نہیں چاہتے کہ اُن کے مذہب کا کوئی مسئلہ قانون میں بنایا جاوے۔ اگر بالفرض ایک قانون بنایا جاوے کہ ہر مسلمان کو نماز پڑھنی فرض ہے، تب بھی وہ متعصب مولوی ایسا قانون بننے سے مخالفت کریں گے۔ وہ لوگ کچھ جائیداد نہیں رکھتے۔ اُن کا پیشہ جاہلوں کو بہکا کر روٹی کمانے کا ہے۔''(۹)

ڈاکٹر قدسیہ خان اپنی تصنیف 'سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ' میں ایسی گمبھیر صورتِ حال میں سرسید احمد خاں کی ذہنی کشمکش کی عکاسی اِن الفاظ میں کرتی ہیں:

''اس پُرآشوب دور میں سرسید کے ذہن نے جن چیزوں کا خاص اثر لیا وہ ملک کی سماجی ابتری، اقتصادی بحالی اور روحانی انحطاط تھا۔ اس کے جو دردناک نتائج ہوئے وہ نشتر بن کر ان کی روح میں اتر گئے۔''(۱۰)

سرسید احمد خاں دین میں اجتہاد کے بہت قائل تھے، ان کا خیال تھا کہ اس زمانے میں درپیش سیاسی و معاشرتی مسائل کو اجتہاد کے ذریعے آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے لیکن نام نہاد مفتیوں اور مقلدوں نے اُن کی ایک نہ چلنے دی۔ سُنّی علما اس سلسلے میں سب سے زیادہ آڑے آئے۔ سرسید کا اِن علما کے لیے طنز کا باریک انداز ملاحظہ ہو:

''متاخرین اہلِ سُنت و جماعت نے عجیب غلط مسئلہ بنایا ہے کہ اجتہاد ختم ہو گیا اور اب کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا مگر اب تک اُن کو اِس میں شبہ ہے کہ نعوذ باللہ منہا مثل خاتم النبیین کے خاتم المجتہدین کون ہے؟''(۱۱)

سرسید احمد خاں عقیدے کے اعتبار سے غیر مقلدین میں شمار ہوتے تھے، اس لیے معاشرتی و مذہبی معاملات میں ان کا زیادہ تر مناقشہ مقلد یا اہلِ سُنت علما کے ساتھ رہتا لیکن اجتہاد کے معاملے میں وہ اپنے ہم خیال علما کی خبر لینے سے بھی نہیں چُوکتے۔ ذرا طنز کے یہ تیور بھی دیکھیے:

''اِس زمانے میں ایک فرقہ ہے جو اپنے تئیں اہلِ حدیث کہتا ہے اور اس کے مخالف اُس کو وہابی کہتے ہیں۔ وہ فرقہ تقلید کا منکر اور عمل بالحدیث کا قائل ہے مگر وہ بھی تقلید میں پھنسا ہوا ہے، اِس لیے کہ اُس نے حدیثِ مجتمعہ میں درایت کو چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس کو حرام سمجھتا ہے اور حدیثوں کی نسبت اگلے لوگ جو لکھ گئے ہیں، اُس کی تقلید کرتا ہے۔''(۱۲)

سرسید کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ اجتہاد کی برکات کو کام میں لاتے ہوئے اسلام کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیں۔ زندگی بھر اُن کی بھرپور کوشش رہی کہ مسلمان علما، ذاتی تعصّبات اور فروعات کو چھوڑ کر اسلام کی روشن، مرغوب اور قابلِ عمل تصویر نہ صرف دنیا کے سامنے پیش کریں بلکہ خود بھی اُس کا عملی نمونہ نظر آئیں لیکن ظاہر پرست اور مطلب برآر مُلاؤں اور اندھی تقلید پہ مائل و قائل عامی مسلمانوں کی موجودگی میں اُن کی یہ مساعی رنگ نہ لا سکیں۔ اُن کے نزدیک دینِ اسلام کو ایک ڈِبے میں بند رکھنے پہ اِصرار کرنے والوں نے دین کی شکل مسخ کر کے رکھ دی۔ فرماتے ہیں:

''طوطے کی طرح اللہ اللہ جپنا اور یا ہو کبوتر کی مانند غوٹرغوں غوٹرغوں کرنا اللہ کی یاد نہیں ہے۔۔۔ اب خیال کرو اِن بزرگواروں سے اسلام نے کیا عزت پائی اور اُن کے حال سے اسلام کی صورت کیسی دکھائی دی۔ اسلام ایسا دکھائی دیا جیسے ایک ضعیف پیر مرد پر کڑ کھایا ہوا،

مَیلا بدن، ٹوٹے دانت، ہڈی پر چمڑا چمٹا ہوا، کنپٹیاں بیٹھی ہوئیں، پیٹ پیٹھ سے ملا ہوا، کمر کُبڑی، ٹانگیں ٹھٹھری، ہاتھ پاؤں کانپتے ہوئے، لڑکھڑا لڑکھڑا لاٹھی ٹیک ٹیک ایک قدم آگے دھرا اور کپ کپا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا پھٹی گدڑی پڑی ہوئی، اِدھر سے ران کھلی اُدھر سے چُوتڑ کھلا، جدھر گئے اُدھر ہزاروں مکھیاں چمٹ گئیں۔ اُدھر کتے بھوں بھوں کر کر پیچھے پڑ گئے۔ جس قوم کے سامنے سے نکلے اُس نے نفرت کی۔ ہر طرف سے دور دور پرے پرے کی آواز سنی اور ذِلت کے لیے مسلمان دنیا میں ضرب المثل ٹھہرے۔''(۱۳)

سرسید کے نزدیک مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور دینی جہالت ہی قابلِ اعتراض نہ تھی بلکہ اِن کی اخلاقی حالت سے بھی انھیں بے حد تشویش تھی۔ بالخصوص جب انھوں نے لندن کے سترہ ماہی قیام کے دوران 'سپیکٹیٹر' (Spectator) اور 'ٹیٹلر' (Tatler) کی فائلوں کا مطالعہ کیا تو انھیں شدت سے احساس ہوا کہ کسی قوم کی ترقی کا سفر اس وقت تک شروع ہی نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی اخلاقی حالت قابلِ رشک نہ ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے سٹیل اور ایڈیسن کے انھی پرچوں سے متاثر ہو کر 'تہذیب الاخلاق' کے اجرا کا فیصلہ کرلیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس پرچے کا بنیادی مقصد ہی مسلمانوں کی بدتر اخلاقی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے درجنوں مضامین لکھے، جس میں نہ صرف ہندستانی مسلمانوں کو مثالی معاشروں کی تصویریں دکھائیں بلکہ ان کی اخلاقیات اور سماجی رویوں کا جی بھر کے مذاق بھی اڑایا۔ ان کے ایک مضمون 'بحث وتکرار' میں مقامی لوگوں کی ایک غیر اخلاقی حرکت کا طنز وتضحیک سے بھرپور یہ نقشہ ملاحظہ ہو، جس میں مشاہدہ، موازنہ اور مکالمہ ایک ساتھ جلوہ گر ہے:

''جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چِر کر کانوں سے جالگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منھ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ اِس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُس کی ٹانگ اِس کی کمر میں، اُس کا کان اِس کے منھ میں اور اِس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں، اُس نے اِس کو کاٹا اور اِس نے اُس کو بھنبوڑا؛ جو کمزور ہوا وہ دُم دبا کر بھاگ نکلا۔ نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کرا آپس میں مل بیٹھتے ہیں، دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے: ''واہ! یوں نہیں یوں ہے'' وہ کہتا ہے ''واہ! تم کیا جانو'' وہ بولتا ہے: ''تم کیا جانو'' دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی

ہے، رُخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اُڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی جلدی چلنے لگتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں؛ آنکھ، ناک، بھَوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں ؛عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستینیں چڑھا، ہاتھ پھیلا، اُس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اِس کی ڈاڑھی اُس کی مٹھی میں، لپاڈکی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑوایا تو غراتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا ایک اُدھر، اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کم زور نے پِٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔''(۱۴)

۱۸۶۹ء میں سر سید احمد خاں نے اپنے بیٹے کے ہمراہ لندن کا سفر کیا اور وہاں کے قیام کا حال جناب محسن الملک کے نام خطوط میں لکھتے رہے، جو بعد ازاں 'مسافرانِ لندن' کے عنوان سے چھپا۔ اس میں متعدد مقامات پر وہ انگریزوں کی ترقی دیکھ کر اُمتِ مسلمہ کی حالتِ زار پر کڑھتے نظر آتے ہیں۔ کہیں انگریز مصنّفین کی جانبدارانہ تصانیف کو نشانہ بناتے ہیں اور کہیں نادان مسلم مؤرخین کی حماقتوں سے پردہ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ اس میں طنز وتنقیص کا انداز کچھ اس طرح کا ہی:

''ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بے جا تعصب اور تنزل وموجودہ اور ذلتِ آیندہ کے خیال سے رنج وغم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہے، اس میں بھی وہی حماقت اور نالائقی اور گمراہی ہے جو اور تمام کاموں میں ہے، پس کوئی کیا کرے، بداقبالی، بدنصیبی کا کچھ علاج نہیں!''(۱۵)

''انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھی کتابوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں، جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے۔''(۱۶)

''ایک عجیب بات سنیے کہ جو کتاب چھپ چکی ہے، اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ جو الزام جلا دینے کا کتب خانہ مصر کا نسبت حضرت عمرؓ کی لگایا جاتا ہے، غلط ہے اور یونانی اور روسی تاریخوں سے ثابت کیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر کے زمانے میں جلا (بے وقوف، شیخی پسند، بعض ناواقف مسلمان مؤرخوں نے اسی واقعہ کو مسلمانوں نے جب مصر فتح کیا، اسی کے ساتھ لگا دیا) اِس امر کا ایسا مستحکم ثبوت دیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر نے جلایا جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔''(۱۷)

اس میں کوئی شک نہیں کہ برِعظیم کی مسلم تہذیب میں سر سید کی حیثیت ایک منارۂ نور کی ہے۔

وہ اوران کی تحریک نہ صرف اس زمانے میں برِعظیم کی سماجی، سیاسی، مذہبی، تعلیمی، ادبی اور صحافتی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے بلکہ آج تک ہماری ثقافتی ومعاشرتی اقدار پر ان کی مثبت یا نیم مثبت چھاپ محسوس کی جاسکتی ہے۔ بالخصوص ان کی زندگی کی آخری چار دہائیوں کا ایک ایک لمحہ تدبر، تفکر، تحرک اور تردّد کی ایسی ان تھک اور بے مثال کاوشوں سے عبارت ہے کہ تاریخ میں ایسی دوسری مثال ڈھونڈ نا مشکل ہے۔ مولوی عبدالحق کے بقول:

> ''ایسے جلیل القدر مفکر، جنھوں نے اپنی قوتِ فکر وعمل سے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، قوموں کی قسمتیں بدل دیں اور ان کو پستی و درماندگی کی دلدل سے نکال کر صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کی، صدیوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ سرسید کا شمار ایسی ہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے۔''(۱۸)

ان کی وفات پر ٹائمز آف لندن نے لکھا:

> ''مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِن کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔''(۱۹)

حوالہ جات وحواشی

۱۔ الطاف حسین حالی، کلیاتِ نثر حالی، (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، نومبر ۱۹۶۸ء ص:۸۱

۲۔ ایضاً، ص: ۵۳

۳۔ سرسید احمد خاں، مقالاتِ سرسید، (حصہ اول، مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، اکتوبر ۱۹۶۲ء، جنوری ۱۹۶۵ء، ص: ۱۰۔۱۱)

۴۔ ایضاً، ص:۲۱

۵۔ رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند، مشمولہ: ماہِ نو، سرسید احمد خاں نمبر، ص: ۳۷۱

۶۔ ایضاً، ص: ۳۷۲

۷۔ مولوی عبدالحق، حالات وافکار: سرسید احمد خاں، کراچی: انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، ۱۹۷۵ء، ص:۱۳۶

۸۔ سید ابوالخیر کشفی، سرسید کا آئینہ خانۂ افکار، کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۵۳

۹۔ سرسید احمد خاں، مقالاتِ سرسید، ص:۱۷۹

۱۰۔ ایضاً، ص:۹۔۱۰

۱۱۔ ایضاً، ص:۲۹۰

۱۲۔ ’اگلے زمانہ میں علومِ دینیہ اور علومِ عربیہ وفلسفۂ یونانیہ کی ترقی کس وجہ سے تھی اور اب کیوں تنزل ہو گیا ہے؟‘‘ ایضاً، ص:۲۷۰

۱۳۔ ’حکایت: ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیا دار کی‘ مشمولہ: ایضاً، ص: ۲۸۲۔۲۸۳

۱۴۔ سرسید احمد خاں، مقالاتِ سرسید، ص:۱۷

۱۵۔ مسافرانِ لندن، مشمولہ: ماہِ نو، سرسید احمد خاں نمبر، ص:۴۰۱

۱۶۔ ایضاً، ص:۳۹۷

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً، ص:۱۷۵

۱۹۔ الطاف حسین حالی، کلیاتِ نثر حالی، ص:۶۸